قائم رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ تو اُردو کے سوا اور کوئی متبادل زبان اس کی جگہ نہیں لے سکیگی۔ ہمارے تصوّف، ہمارے فلسفہ اور ہمارے دینی و ثقافتی ادب کے شاہکار اسی میں پائے جاتے ہیں۔ اور یہی وہ بولی ہے جس کو غالبؔ سرسیدؔ، حالیؔ، شبلی اور اقبال ایسی شخصیتوں نے اظہارِ خیال کے لئے چُنا۔ اس میں ہمارے ذہین ترین افراد کی کاوشوں کا بہترین حصّہ ہے۔ اور پھر یہ ایک زبان ہی نہیں، بلکہ یہ ایک اندازِ فکر بھی ہے، جس نے کہ ایک خاص تہذیب اور ایک خاص شائستگی کو جنم دیا ہے۔ یہی نہیں یہ ہماری تاریخ بھی ہے۔ اس سے اگر ہم چاہیں تو اپنے عروج و زوال کے ان تمام ادوار کا پتہ چلا سکتے ہیں کہ جن سے ہم گذشتہ ڈیڑھ دو صدی میں دوچار ہوئے۔ چنانچہ اب اگر ہم اسے چھوڑ کر کسی علاقائی زبان کو اپنی قومی زبان ٹھہرائیں تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم ماضی کے اس عظیم ورثے سے دست کش ہو جائیں، اور ان تمام کوششوں کو ملیامیٹ کر دیں کہ جن کی وجہ سے ہم اس لائق ہوئے ہیں کہ زمانہ کے ارتقائی تقاضوں کا ساتھ دے سکیں۔ خلیفہ صاحب نے اس حقیقت کو بڑی تفصیل سے بیان کیا کہ اُردو موجودہ علوم و فنون کی پیچیدہ مصطلحات کو اپنے قالب میں ڈھالنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے اور لوگ جو اس کی بے مائگی کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں وہ خود بے مایہ ہیں۔

اُنہوں نے کہا کہ ہماری علاقائی زبانیں ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہیں۔ اور ان کو ترقی کے اس فراز تک پہنچنے میں کہ جہاں اس وقت اُردو ممکن ہے ایک عرصہ چاہیئے۔ تو کیا جب تک یہ زبانیں ترقی نہیں کر پاتیں ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ اور خیالات و افکار کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ نہ چلیں اور کیا ہم تہذیب و تمدّن کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو روک سکتے ہیں۔ اور زمانہ کی برق رفتاریوں سے بچھڑ کر زندہ رہ سکتے ہیں؟ یہ ہیں وہ سوالات کہ زبان کے سلسلہ میں جن کی اہمیّت کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

سالک صاحب نے مسئلہ کے اس پہلو پر روشنی ڈالی کہ لب و لہجہ کی دُشواری اور محاورہ کی پابندی سے ہمیں گھبرانا نہیں چاہیئے۔ اُنہوں نے کہا کہ اُردو پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔ ہمارے ہاں علم و ادب کے ایسے ایسے فاضل پیدا ہوئے ہیں کہ جنہوں نے اہلِ زبان سے زبان دانی کی داد پائی ہے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ اور ان کی خدمات ایسی گرانمایہ ہیں کہ رہتی دنیا تک ان سے استفادہ کا عمل جاری رہے گا۔

اُنہوں نے علاقائی زبانوں کے بارہ میں اس اشکال کا ذکر کیا کہ وہ آپس میں اس درجہ مختلف ہیں کہ کسی کے لئے بھی ایک دوسرے کی زبان کو اپنا لینا آسان نہیں۔ مثلاً بلوچی، پشتو اور سندھی ہم پنجابیوں کے لئے بالکل ناقابلِ فہم ہیں۔ اور ان کے تلفظ پر ہمیں مطلق قدرت نہیں۔ اور ان کی نسبت اُردو بہرحال بہت ہی سہل اور آسان ہے۔ یہی حال پنجابی کا ہے۔ اسے اگر قومی زبان کی حیثیت دی جائے تو سندھی،

اور بلوچی یا پشتو بولنے والوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا۔ اور کسی طرح بھی یہ زبان مشترکہ اور قومی زبان کی جگہ نہیں لے سکے گی۔ علاوہ ازیں اس طرح علاقائی تعصّبات اُٹھ کھڑے ہونگے اور ملک کا ہر ہر حصّہ یہ چاہے گا کہ اسی کی زبان کو ملکی زبان کا اعزاز بخشا جائے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انتشار اور گڑبڑ کا وہ طوفان برپا ہوگا کہ سنبھالے نہیں سنبھل پائے گا۔

سالک صاحب نے محاورات سے متعلق تنگ نظری کی مذمت کی۔ اور یہ کہا کہ اہلِ زبان کو اس معاملہ میں تشدّد نہیں برتنا چاہیئے۔ کیونکہ اب اس کے دائرے بہت پھیل گئے۔ اور یہ صرف غزل و شعر کی محدود زبان نہیں رہی۔ بلکہ سنجیدہ علمی مطالب کے اظہار کا بھی وسیع ترین رابطہ ہے۔ لہٰذا اس کو اگر تمام ترقی یافتہ زبانوں کے پہلو بہ پہلو چلنا ہے تو دلی اور لکھنؤ کے نقطۂ نظر کی پیروی کو یکسر ترک کرنا پڑیگا۔ اور صرف یہ دیکھنا پڑے گا کہ ایک ادیب یا مصنّف جن خیالات و افکار کو بیان کرنا چاہتا ہے اس میں وہ کامیاب ہے یا نہیں۔ اور پڑھنے والے کے ذہن میں اُس نے کوئی کیفیت پیدا کی ہے یا نہیں۔ اگر اس کی تحریر میں ذوقِ سلیم کے خلاف کوئی چیز نہیں ہے۔ اور اس نے اپنے قارئین کو متاثر کیا ہے تو یہ بہت ہے۔

لب و لہجہ کی دُشواریوں پر گفتگو کرتے ہوئے اُنہوں نے کہا کہ مسعود صاحب کا اعتراض صحیح ہے۔ لیکن اگر لکھنؤ اور بہار کے لب و لہجہ میں اختلاف ہوسکتا ہے، اور دلی اور دکن کا فرق مستند ہے، تو اس میں مغربی پاکستان کو بھی شامل کر لیجئے۔

میاں افضل حسین صاحب وائس چانسلر اور ڈاکٹر باقر صاحب نے بھی لسانیات کے بعض عقدوں کو سلجھایا، اور اس سلسلہ میں نہایت ہی مفید نکات کی طرف توجہ دلائی۔ اور بالآخر یہ دلچسپ صحبت کوئی دو گھنٹے جاری رہ کر اختتام پذیر ہوئی۔